مولانا عبدالمجید سالک

سلاطین ہند کی حیثیت

خلافت سے وابستگی

ہندوستان پر سب سے پہلا حملہ محمد بن قاسم نے کیا جو دمشق کے اموی خلیفہ کی طرف سے اس پر مامور کیا گیا تھا۔ فتح سندھ کے بعد اس علاقے پر جو حکومت قائم ہوئی وہ خلیفۃ المسلمین کی حکومت تھی۔ سندھ کے گورنر دربارِ خلافت ہی کی طرف سے مامور ہو کر آتے تھے اور اسی کے سامنے جواب دہ تھے۔

پانسو سال بعد جب سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کا رُخ کیا تو بنو اُمیہ کی خلافت مدتوں سے ختم ہو چکی تھی اور خلافت آلِ عباس کا مرکز بغداد تھا۔ خلیفۂ وقت نے محمود کی اسلامی حمیت و شجاعت سے متاثر ہو کر[۱] سے خلعت اور خطاب سے سرفراز کیا۔ اگرچہ اس وقت تک مرکزِ خلافت کمزور ہو چکا تھا اور اس کے مختلف صوبوں کے حکمران عملاً خود مختار تھے لیکن خلیفہ کی شرعی حیثیت تمام سُنّی مسلمانوں کے نزدیک مسلّم تھی۔ اور خود مختار سلطان بھی رسماً خلیفہ کے حضور اظہارِ اطاعت کو ضروری سمجھتے تھے۔ محمود غزنوی نے ہی اپنے لئے سلطان کا لقب تجویز کیا۔ لیکن خلیفہ کی بیعت و اطاعت کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ اس زمانے کے اکابرِ علم کی رائے یہ تھی کہ جو علاقے مرکزِ خلافت سے دور واقع ہوں اور ان پر آسانی سے حکومت نہ کی جا سکے ان کے حکمران خلیفۂ اسلام کے نائب ہو گئے ہیں[۲] یہاں تک کہ پندرھویں صدی کے وسط میں بھی خلیل بن شاہین الظاہری نے یہی لکھا کہ مشرق و مغرب میں کوئی حکمران "سلطان" کا لقب اختیار نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ اس کے اور خلیفۂ اسلام کے درمیان قرارِ داد اطاعت نہ ہو جائے[۳] ۔ چنانچہ جب سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کا الحاق اپنی سلطنت سے کرایا۔ تو چونکہ وہ قانونی طور پر نائب خلیفہ تھا۔ اس لئے پنجاب خلافتِ اسلامیہ کا ایک حصّہ قرار پایا۔ محمود کے جانشین بھی برابر خلیفۂ عباسی کی خدمت میں اظہارِ اطاعت کرتے رہے۔ پھر جب محمد غوری نے پنجاب کو فتح کیا تو غیاث الدین اور محمد غوری کے سکوّں پر برابر خلیفہ کا نام کندہ ہوتا تھا۔ غیاث الدین کو خلیفہ المستضی بامر اللہ اور الناصر لدین اللہ کی طرف سے بارہا خلعت عطا ہوئے اور اس کو "ناصر امیر المومنین" لکھا گیا[۴]۔

جب دہلی میں قطب الدین ایبک حکمران ہوا تو اس کو محمد غوری کے بھتیجے غیاث الدین محمود سے سندِ حکومت

۱؎ آرنلڈ کی خلافت صفحہ ۲، ۴۷ ۲؎ بحوالہ چہار مقالہ نظامی عروضی ۳؎ بحوالہ "خلافت" از آرنلڈ صفحہ ۱۰۱-۱۰۲ ۴؎ منہاج سراج صفحہ ۷۸-۱۲۸

۳۶۶۶۶

ملی لیکن سمجھا یہی گیا۔ کہ وہ خلیفہ اسلام کا مطیع و منقاد ہے۔ ملتان میں قرامطہ کے استیصال کی وجہ سے (جو حقیقت میں خلافت اسلامی کے دشمن تھے) محمد غوری اور قطب الدین ایبک خلافت کے منظور نظر ہو چکے تھے، دہلی کا پہلا سلطان جس نے باضابطہ خلیفہ اسلام سے خلعت تسلیم پایا، شمس الدین التمش تھا جس کے سکوں پر پہلے دن ہی سے خلیفہ الناصر الدین اللہ کا نام کندہ تھا۔ ۶۲۶ھ ہجری میں خلیفہ ابوجعفر منصور المستنصر باللہ کے وکلا دہلی پہنچے۔ اور سلطان ان کے وزراء بلکہ غلاموں تک کے لئے خلعت لائے۔ اس موقع پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ شہر آراستہ کیا گیا اور وکلاء کی بے حد آؤ بھگت کی گئی[۱]۔ علاء الدین مسعود شاہ نے ۶۴۱ھ میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم کا نام اپنے سکے پر کندہ کر دیا۔

جب ۶۵۶ ہجری میں ہلاکو خان نے مستعصم اور اس کی خلافت رختم کر دیا۔ اور قلمرو خلافت کے اکثر حصے منگولوں کے قبضے میں چلے گئے تو بڑی مشکل پیش آئی لیکن سلاطین دہلی نے مستعصم کی وفات کے بعد بھی اسی کے نام کا سکہ و خطبہ جاری رکھا۔ حالانکہ یہ حادثہ سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ اور "طبقات ناصری" میں جو سلطان ناصر الدین محمود کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ زوال خلافت بغداد کی پوری کیفیت درج ہے[۲]۔ مستعصم کا نام اس کی وفات سے چالیس سال بعد تک دہلی کے سکوں پر موجود رہا۔ یہاں تک کہ جلال الدین فیروز خلجی کے انتقال کے بعد رکن الدین ابراہیم نے اس کو محو کر کے اپنے آپ کو "ناصر امیر المومنین" لکھا۔ علاء الدین خلجی نے اس لقب پر "یمین الخلافۃ" کا اضافہ کر دیا۔ یعنی اگرچہ خلیفہ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن یہ سلاطین بدستور مددگار خلافت کہلاتے رہے۔ جلال الدین خلجی کے زمانے میں ایک سازش ہوئی کہ اب چونکہ خلافت عباسیہ باقی نہیں رہی۔ اس لئے ایک بزرگ سیدی مولٰی کو خلیفہ بنا لیا جائے۔ لیکن جلال الدین نے اس سازش کو سختی سے دبا دیا۔ اور سازشیوں اور ان کے نامزد خلیفہ کو قتل کر دیا[۳]۔ بعض لوگوں نے علاء الدین خلجی کو خلیفہ بننے کی ترغیب بھی دی، لیکن وہ نہ مانا۔

لیکن اس کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ نے اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اور یہ لقب اختیار کیا "الامام الہمام خلیفہ رب الکونین السلطان ابن السلطان الواثق باللہ امیر المومنین قطب الدنیا والدین ابوالمظفر مبارک شاہ" لیکن اس کے بعد ناصر الدین خسرو اور پھر غیاث الدین تغلق نے وہی پرانا لقب ناصر امیر المومنین ہی کافی سمجھا۔ اس زمانے میں امراء و علما عام طور پر خلیفہ اور خلافت کے مسئلے پر بحث کیا کرتے تھے اور وہ گروہ غالب رہتا تھا۔ جو حقیقت پسند تھا۔ اور یہ رائے دیتا تھا کہ جب خلیفہ اور خلافت باقی ہی نہیں اور کوئی امیر المومنین موجود ہی نہیں تو اس کا ناصر بننا کیا معنی؟ محمد تغلق اس رائے کا قائل تھا لیکن کوئی نئی راہ اختیار کرنے میں تامل کر رہا تھا۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ عباسی خلافت مصر میں منتقل ہو گئی ہے اور پناہ گزین المستکفی باللہ امیر المومنین تسلیم کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ اس

---

[۱] منہاج سراج صفحہ ۱۷۴ [۲] منہاج سراج صفحہ ۴۲۰۔۴۲۳ [۳] ضیاء الدین برنی صفحہ ۲۰۸۔۲۱۲

نے اس نئے خلیفہ کے حضور میں اظہارِ اطاعت کیا۔ کچھ مدت بعد مصر سے خلیفہ الحاکم ثانی کی طرف سے حاجی سعید صرصری علَم، سندِ حکومت اور خلعت لے کر پہنچ گیا جس کا بڑی شان سے استقبال کیا گیا۔ شہر آراستہ ہوا اور بے شمار روپیہ خیرات کیا گیا۔ محمد تغلق کو تین دفعہ خلعت اور علَم پہنچے۔ اس نے ہر دفعہ نہایت عجز و انکسار سے خلیفہ کی بخشش کو قبول کیا۔ اور جواب میں بیش بہا تحائف بھیجے۔ دربار کے شاعر بدر چاچ نے قصیدے لکھے۔ جن میں محمد تغلق کو آسمان پر چڑھانے کے بجائے خلیفہ کی تعریفیں کیں۔ مثلاً ؎

امام حق کہ شد اورا محمّد تغلق   بدل غلام و بہ تن چاکر و بجاں مولاؔ[1]

فیروز شاہ کو بھی خلیفہ کی طرف سے خلعت اور علم وصول ہوئے اور اس نے انتہائی عجز سے ان کو قبول کیا[2]۔ اس کے سکوں پر المستکفی باللہ کے لڑکوں یعنی ابو العباس احمد اور ابو الفتح المعتضد باللہ کے نام کندہ ہیں۔ اسی سلطان کے زمانے میں دکن کی بہمنی حکومت کو بھی قاہرہ سے شرفِ قبول حاصل ہوا۔

خاندان سادات کا سلطان خضر خان تیمور کے ماتحت تھا اور اپنے آپ کو تاجدار نہ کہتا تھا پھر شاہ رخ نے اس کو اجازت دے دی کہ خطبہ میں اپنا نام شامل کر لے۔ خضر خان کے بیٹے مبارک شاہ اور اس کے جانشینوں نے صرف نائب امیر المومنین کہلانے پر اکتفا کیا۔ یہی کیفیت لودھیوں کے زمانے میں جاری رہی۔ ۱۵۱۷ء میں ترکانِ آل عثمان نے خلافتِ عباسی کے نام نہاد وجود کو بھی ختم کر دیا۔ اور سلطانِ ترکی خلیفہ بن گیا۔ لیکن خاندان تیموری نے ترکانِ آلِ عثمان کی خلافت کو کبھی قبول نہیں کیا۔

مغلوں سے قبل دہلی کے حکمران سلاطین کہلاتے تھے۔ لیکن بابر نے "بادشاہ" کا لقب اختیار کیا۔ گویا مغل بادشاہوں کے زمانے میں یہ تصور ختم ہو گیا کہ ہندوستان کی سلطنتِ اسلامی سیاسی اعتبار سے ایک ناقابلِ تقسیم دنیائے اسلام کا جزو ہے۔ ہمایوں کے فرار کے بعد سوریوں نے نام نہاد خلیفہ کا ذکر اپنے سکوں پر کیا لیکن مغلوں نے سکہ و خطبہ میں اپنے سوا اور کسی امام یا خلیفہ یا سلطان کا نام لینا روا نہیں رکھا۔

اس میں شک نہیں کہ خلافتِ اسلامی کے مرکز اور خلیفہ اسلام کی ذات سے سلاطین کی یہ وابستگی محض شرعی و قانونی حیثیت رکھتی تھی۔ نہ خلافت ہی اس قدر قوی رہ گئی تھی۔ کہ وہ ان عقیدت مند سلاطین کے کاروبارِ حکومت میں عملاً مداخلت کر سکتی نہ یہ سلاطین ہی اس امر کو روا رکھ سکتے تھے۔ ہمارے خیال میں صرف بعض سلاطین ہی ایسے ہوں گے جو ذاتی حسنِ عقیدت کی وجہ سے "جانشین پیغمبر خدا صلعم" سے اظہار اطاعت کرتے ہوں۔ ورنہ اکثر تو محض علما اور عامۃ المسلمین میں اپنی ہر دلعزیزی کو برقرار رکھنے اور اپنی حکومت کو اسلامی شکل میں پیش کرنے کی غرض سے یہ تدبیر اختیار کرتے تھے۔ مثلاً علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی آزاد خیالی اور بعض علمائے سے ان کے اختلافات اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ وہ دینی حلقوں کے

---

[1] قصائد بدر چاچ صفحہ ۲۹ [2] عفیف صفحہ ۲۷۴، ۲۷۵

غیر محدود اقتدار کے روادار نہ تھے۔ لیکن لامحالہ انہیں بھی خلافت سے اظہارِ عقیدت کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ عوام ان سے برگشتہ نہ ہوجائیں۔ بہرحال مندرجہ بالا تفصیل سے یہ تو ثابت ہے کہ اتحادِ عالمِ اسلام کا جذبہ مسلمانوں میں ہمیشہ نہایت قوی رہا ہے اور وہ کسی نہ کسی شکل میں تمام خلافت کے ضرور قائل رہے ہیں۔ خواہ اس خلافت کو دنیوی طاقت حاصل ہو یا نہ ہو۔

سلاطین اور شریعت اسلامی

خلافت سے اس نام نہاد وابستگی کے سوا اور کوئی ثبوت اس امر کا موجود نہیں کہ دہلی کے سلاطین اور بادشاہ کاملاً خود مختار نہ تھے۔ بلاشبہ قانون ملکی کی اساس شریعت اسلامی پر تھی۔ اور کوئی حکمران شریعت کو پسِ پشت ڈال کر مقبول عام نہ رہ سکتا تھا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض حکمرانوں نے بعض حالات میں شریعت کی خلاف ورزی کی۔ لیکن ایسی مثالیں بے شمار ہیں کہ وہ احکامِ شریعت کے آگے جھک گئے۔ محمد تغلق بعض آدمیوں کو قتل کرنا چاہتا تھا، علماء و فقہا نے احکام شرع کے ماتحت اس کی مخالفت کی۔ لیکن جب اس کے دلائل و براہین تھے تو منطقی اعتبار سے قائل ہوگئے اور انہیں فتوے دینا پڑا یعنی محمد تغلق نے عاملانِ شریعت سے فتوے لئے بغیر اپنے حکم پر عمل نہیں ہونے دیا۔ سلطان علاءُ الدین خلجی نہایت اکھڑ قسم کا حکمران تھا۔ لیکن قاضی مغیث سے اس کا جو معاملہ ہوا اس کو تمام مورخین نے اہمیت دی ہے۔ جب سلطان نے رشوت خوار افسروں اور اہلکاروں کو وحشیانہ سزائیں دیں تو قاضی مغیث نے علی الاعلان کہ دیا کہ یہ سزائیں شریعت حقہ کے خلاف ہیں۔ پھر سلطان نے پوچھا کہ میں نے شہزادگی کے زمانے میں دیوگڑھی (دکن) کی فتح کے موقع پر جو مالِ غنیمت حاصل کیا آیا وہ میری ملکیت ہے یا بیت المال کی۔ قاضی نے جواب دیا۔ چونکہ مالِ غنیمت عساکر اسلامی کی مدد سے حاصل ہوا تھا۔ اس لئے وہ بیت المال کا ہے۔ اس کے بعد سلطان نے سوال کیا کہ بیت المال میں سلطان اور اس کے بچوں کا کیا حصہ ہے۔ اس کا جواب قاضی مغیث نے شریعت اسلامی کے مطابق تفصیل سے دیا۔ جس پر سلطان غیظ و غضب سے آگ بگولا ہو گیا۔ لیکن قاضی نے کہا کہ میں اظہارِ حق سے باز نہیں رہ سکتا۔ آپ مجھے قید میں ڈال دیجئے۔ یا قتل کر دیجئے۔ میں تو قرآن و حدیث کے سوا اور کسی مصلحت کی بنا پر فتوے نہیں دے سکتا۔ سب کو یقین تھا کہ قاضی مغیث کے قتل کا حکم دیا جائے گا۔ لیکن جب دوسرے دن قاضی مغیث اپنے گھر والوں کو آخری الوداع کہہ کر دربار میں حاضر ہوا تو سلطان نے مرحمتِ خسروانہ سے کام لے کر قاضی کو خلعت اور انعام عطا کیا۔ چونکہ اصل جھگڑا سزاؤں کی شدت پر ہوا تھا۔ اس لئے سلطان نے قاضی سے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہوں۔ میں بغاوت کے سدِباب کے لئے جس میں ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں ایسے احکام صادر کر دیتا ہوں۔ جو سلطنت کی بہتری اور عامۃ الناس کی بہبود کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ جب بعض لوگ توجہ اور احترام

له تاریخ مبارک شاہی صفحہ ۱۱۵ - ۱۱۶

سے کام نہیں لیتے ۔ اور میرے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو میں انہیں مطیع و فرمان بردار بنانے کے لئے سختی کرتا ہوں ۔ میں بعض افعال کے جواز یا عدم جواز کو نہیں جانتا ۔ اور وہی کرتا ہوں جو سلطنت کی بھلائی کا تقاضا ہوتا ہے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ روزِ قیامت مجھ سے کیا سلوک کیا جائے گا ؟

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علاؤ الدین خلجی اور علما کے درمیان اختلاف محض تاویل و توجیہ کا تھا ۔ خلجی شریعت کا منکر نہیں تھا ۔ بلکہ یہ محسوس کرتا تھا کہ علما عملی سیاست سے بے بہرہ ہیں اور انتظام مملکت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے یہ وہ اختلاف ہے جو علمائے اسلام اور سلاطین اسلام کے درمیان ہمیشہ سے چلا آتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو وضع قوانین میں بہت ہی کم اختیارات حاصل تھے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے شخصی اور مذہبی قانون میں وہ بالکل مداخلت نہ کر سکتے تھے ۔ ہندوؤں کی بعض رسوم بعض مسلمان سلاطین کو بالکل ناپسند تھیں ۔ لیکن وہ ان میں مداخلت کی جرأت نہ کر سکتے تھے[۱] ۔ شریعت کی کھلم کھلا بے احترامی یا خلاف ورزی ناقابلِ تصور تھی ۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کی وفاداری ختم ہو جاتی تھی ۔ جن کو حکم ہے کہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق ۔ چنانچہ تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایسے حالات میں مسلمانوں حکمران کے خلاف بغاوت کر دی گئی مثلاً ناصر الدین خسرو کے بعض پیروؤں نے اسلام کی توہین کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا تخت چھن گیا[۲] ۔

جب مغل بادشاہ اکبر نے اسلام کے خلاف رویہ اختیار کیا تو مشرق میں بڑے زور کی بغاوت پھوٹ پڑی اور شمال مغرب میں اس کے بھائی نے حملہ کر دیا ۔ سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں ۔ آخر اکبر نے کچھ تالیف قلوب کے لئے اسلام سے وابستگی ظاہر کی اور کچھ راجپوتوں اور ایرانیوں کی مدد سے بغاوت پر قابو پایا ۔ اس کے بعد جہانگیر کو باپ کی حکمت عملی ترک کرنی پڑی اور اسلام سے رابطہ استوار کرنا پڑا ۔ اس نے حضرت مجدد الف ثانی کو قید سے رہائی دے کر انتہائی عزت و احترام کا برتاؤ کیا ۔ اور حضرت کی شرائط کو منظور کیا جو سب کی سب احکام اسلام کے احترام اور ان کی تعمیل کے مطالبہ پر مبنی تھیں ۔

اقتدار کے ستون

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کا اقتدار جن ستونوں پر قائم تھا ۔ وہ یہ تھے :۔ احترام شریعت[۱] جس سے مسلمان عوام مطمئن رہیں ۔ اور علما و فقرا کی تعلیم و تکریم جن سے عامۃ المسلمین کو عقیدت تھی[۲] ہندوؤں کے مذہب اور ان کے معاشرتی ادارات سے تعرض نہ کرنا[۳] امراء کی تنظیم اور ان کی معاشی و غیر معاشی امداد پر اعتماد[۴] سلطنت کے وزرا ۔ حکام اور اہلکاروں کا تعاون[۵] ۔ ہندو اور مسلمان سب کی آسائش و بہبود کی تجاویز پر عمل[۶] فوج کو مطمئن رکھنا ۔ تنخواہوں کے علاوہ اموال غنیمت سے حصہ دینا اور کارہائے نمایاں کا صلہ عطا کرنا ۔

---

۱ ضیاء الدین برنی صفحہ ۲۱۶ - ۲۱۷   ۲ ضیاء الدین برنی صفحہ ۲۱۱ ۔

جو سلاطین تخت سلطنت پر متمکن ہوتے تھے۔ وہ محض وراثت کی وجہ سے حکمرانی کے حقدار نہ سمجھے جاتے تھے۔ بلاشبہ حکمرانی بعض خاندانوں میں محدود ہوتی تھی لیکن اوّل یہ ضروری نہ تھا کہ باپ کی جگہ ضرور ہی بیٹا بیٹھے۔ دوم ہر سلطان کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ علما امراء اور دوسرے وجوہ الناس اس کی ذات پر متفق ہو جائیں۔ سب سے پہلے ان کی بیعت و اطاعت لازمی تھی۔ جب وہ کسی پر اتفاق کر لیتے تو اس کی سلطانی کا اعلان کر دیا جاتا۔ گویا انتخاب کا طریقہ کسی نہ کسی رنگ میں محفوظ تھا۔ معزالدین بہرام شاہ۔ علاء الدین مسعود شاہ و ناصرالدین محمود کے انتخاب کا ذکر منہاج سراج میں موجود ہے[1]۔ عصامی نے شمس الدین کیومرث۔ شہاب الدین عمر اور قطب الدین مبارک شاہ کے انتخاب کا حال لکھا ہے[2]۔ اور تغلق نامہ میں غیاث الدین تغلق کے انتخاب کا ذکر ہے[3]۔ جلال الدین فیروز خلجی نے جنگ میں کامیابی حاصل کر کے تخت پر اپنا حق قائم کر لیا تھا۔ لیکن انتخاب کی ظاہری صورت پھر بھی ملحوظ رکھی گئی[4]۔

خود مختار حکمرانی کے زمانے میں حکمرانوں کی حیثیت وہ تھی جو آج کل رئیس مملکت اور وزیر اعظم کے عہدوں کو متحد کر دینے سے رونما ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ حکمران مرکزی حکومت کے رئیس اعلیٰ تھے، لہٰذا پوری مملکت کے نظم و نسق کی ذمہ داری انہی پر تھی اور دفتر سلطانی حکومت کا سب سے بڑا محکمہ سمجھا جاتا تھا۔ ان سلطانوں اور بادشاہوں کو نظم مملکت پر بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ وہ وزیروں اور امیروں سے مشورہ کرتے۔ انہیں احکام دیتے۔ بعض مقدمات کی سماعت کر کے خود ہی فیصلے صادر کرتے۔ نظم و نسق میں، علم و فضل میں شجاعت میں اور عام وفاداری و میں جو لوگ امتیاز خصوصی رکھتے تھے، انہیں خلعت و خطاب اور انعام و اکرام سے سرفراز کرتے۔ غریبوں، حاجتمندوں اور مفید عام اداروں کی امداد کرتے۔ شاہی دربادوں، جلوسوں اور ضیافتوں میں رونق افروز ہوتے اور ان میں شان و شوکت کی فراوانی کا یہ عالم ہوتا کہ دیکھنے والوں کو خدا یاد آجاتا۔ حکمرانوں کو رسمیات کی پابندی اور عظمت اور دبدبے کے اظہار میں بے انتہا تکلّف سے کام لینا پڑتا۔ اور وہ تھک کر چور ہو جاتے۔ تاریخ کی کتابوں میں ان کی رسمی تقریبات کا حال تفصیل سے لکھا ہے "منہاج سراج عفیف، منتخب التواریخ، خلاصۃ التواریخ۔ ضیا برنی۔ تاثر وغیرہ میں جا بجا ایسی تفصیلات ملتی ہیں اور ابن بطوطہ نے تو انہیں بے حد دلچسپی سے لکھا ہے[5]:

---

[1] منہاج سراج صفحات ۱۹۱-۱۹۸-۲۰۸ [2] عصامی صفحات ۱۹۹-۲۴۱-۳۴۵ [3] تغلق نامہ صفحہ ۱۴۱ [4] ضیاالدین برنی صفحہ ۱۴۳
[5] ابن بطوطہ۔ جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ سے ۲۴۲ تک